ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.7,Issue No.1 (2025)
(January to March)

۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۳ء تک اقبال کی اہم شعری و نثری تخلیقات کا مطالعہ: ایک ارتقائی نظر

A Study of Iqbal's Major Poetic and Prose Works from 1911 to 1923: An Evolutionary Perspective

ڈاکٹر محمد آصف

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ڈاکٹر محمد اشرف

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ گریجوایٹ کالج، ملتان

Dr. Muhammad Asif
Associate Professor, Department of Urdu, Bahuddine Zakariya University, Multan
Email ID : asif475@hotmail.com
Dr. Muhammad Ashraf
Assistant Professor Urdu, Govt.Willayat Hussain Islamia University, Multan
Email ID : ashrafmalik8033@gmail.com

Abstract:
This article presents a comprehensive and developmental analysis of Iqbal's major poetic and prose works produced between 1911 and 1923—a period marked by significant transformation in his intellectual and ideological outlook. Grounded in the broader movements for Islamic revival in the modern Muslim world, Iqbal's writings reflect a deep engagement with the challenges facing the Muslim Ummah. Following his pivotal 1911 address at Aligarh, Iqbal made a conscious decision to devote his intellectual and artistic capabilities to national service. Influenced by contemporary global events, his thought evolved significantly, resulting in a body of work that encapsulates his artistic innovation and philosophical depth. This study highlights how Iqbal's literary and philosophical contributions from this period are fundamentally oriented toward the revival and empowerment of the Muslim Ummah.

Keywords: Allama Iqbal, From 1911 to 1923, Iqbal's major poetic, An evolutionary study, modern Islamic world, international situation

اقبال کا تمام شعری اور نثری سرمایہ اور تمام تر افکار اسلام اور مسلمانوں کے احیاء سے متعلق ہیں اسی لیے احیائے اسلام کی تحریکات سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ برصغیر میں احیائے اسلام کی اولین کوشش حضرت مجدد الف ثانی نے اکبر کے "دین الٰہی" کے خلاف کی۔ پھر عالمگیر نے اس کو سہارا دیا، عہد حاضر میں نجد میں وہابی تحریک، طرابلس میں سنوی تحریک، ایران میں محمد علی باب کی تحریک احیائے اسلام کی اصلاحی تحریکات تھیں۔ حقیقت یہ ہے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں مشابہ صورتحال کے سبب کئی تحریکیں وجود میں آئیں۔ جو ایک دوسرے سے جدا ہونے کے باوجود مقاصد کے لحاظ سے مشترک تھیں۔ جذبہ قومیتِ اسلام، مطلق العنانیت کا خاتمہ، عوام کی جہالت و گمراہی، علماء و صوفیاء کی تنگ نظری و شعبدہ بازی گویا مسلمانوں کے داخلی انحطاط کا خاتمہ اور غیر مسلم حکمرانوں سے

آزادی ان کا مقصد تھا۔ مجاہدین کی تحریک مجاہدین، میر نثار علی کی تنظیم جہاد اور مولوی شریعت اللہ کی دعوتِ اصلاح ایسی ہی تحریکیں تھیں۔ ۱۸۵۷ کے انقلاب کے رد عمل میں تحریک سرسید وجود میں آئی جو مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، اخلاقی، ادبی اور معاشی اصلاح کی تحریک تھی، جس نے اسلام اور سائنس کو ہم آہنگ کیا۔ اسی کے ساتھ ایک اور ہمہ گیر تحریک "تحریک اتحاد اسلامی" تھی۔ علامہ جمال الدین افغانی کا مقصد ممالکِ اسلامیہ کا غیر سیاسی اتحاد، اسلامی ممالک میں جمہوری آزادی اور مذہب و سائنس کی مطابقت تھا۔ غرض اس اصلاحی اور احیائے اسلام کے زمانے میں اقبال نے شاعری شروع کی۔

ابتدا میں اقبال نے ماحول کے روایتی اثرات کے تحت روایتی غزل گوئی کو اپنا شعار بنایا۔ مگر جلد ہی مختلف تحریکات، سرسید کی ادبی مقصدیت اور حالی کی ملی تفاخر اور قومی عظمت پیدا کرنے والی شاعری سے متاثر ہو کر یہ جدید رنگ اختیار کر لیا۔ ۱۹۰۵ تک ان کی شاعری میں نظریہ وطینت، وحدت الوجود، منظر کشی، حسن و عشق کی لہریں دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے مضامین بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے بعد میں پختہ شکل اختیار کی مثلاً خودی، بے خودی، علم، عمل، عشق، عقل، وحدت، نظریہ، ملت وغیرہ۔

۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸ تک ان کی شاعری کا دوسرا دور ہے اس کو دورِ انقلاب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں تحقیقِ فلسفہ اسلامی نے ان کو حقیقی اسلام سے روشناس کرایا۔ مزید براں یورپ کی سیاسی اور معاشرتی حالت کے مشاہدے اور مطالعے نے ان کے ذہن و فکر کے زاویوں کو بدل دیا۔ انھوں نے تین سال کے عرصے میں محسوس کر لیا کہ یورپی زندگی کے لیے تباہ کن تصور وطینت اور قومیت کا تصور ہے ان کے خیال میں یورپی اقوام کا عقلیت پر ضرورت سے زیادہ زور، مشینی ایجادات و سائنسی حرکت اور حقیقت کی مادی تعبیرات نے ان کی تہذیب کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ چنانچہ اس دور میں وہ اسلام کے حقیقی سرچشمے سے سرشار ہوئے۔ اسلام کے احیاء کے لیے انہوں نے اسی دور میں اپنی شاعری کی حکمتِ عملی مرتب کی۔ جس میں ادبی نصب العین کا تعین یعنی شاعری کو احیائے ملت کا وسیلہ بنانے کا عہد کیا۔ یعنی وطینت سے ملیت کی طرف گریز، بے عملی، عجمی تصوف کے خلاف احتجاج، عشق رسول، خودی، آرزو، عمل وغیرہ۔

۱۹۰۸ کے بعد دور سوم شروع ہوتا ہے جو ان کے یورپ میں طے شدہ پروگرام کا عملی اظہار ہے جیسا کہ پروفیسر عبد القادر سروری کا بیان ہے کہ "اقبال نے یورپ میں جو پلان شاعری کا پیدا کیا تھا اب وہ عملی صورت اختیار کرنے لگا۔"(۱) چنانچہ دور یورپ کے بعد سے انہوں نے آخر تک انہی افکار کو زیادہ تفصیل سے پیش کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کی شاعری میں مسلم فرد اور معاشرہ کی تعمیر نو، اس کے لیے انسان کامل کی تلاش، ایمان اور علم و عمل کی وحدت، تضاد، منافقت اور دوئی کا خاتمہ، اسلام، ملت، خودی، بے خودی، معاشی و سیاسی آزادی، عشقِ رسول، توحید، وغیرہ پورے جوش اور شدت کے ساتھ ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب کی تعمیرِ نو روایتی تعبیر سے ممکن نہ تھی، بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

> "وہ وقت کے جدید تقاضوں اور علوم کی بے انتہا ترقی کے پیش نظر علم کلام اور فقہ کے از سر نو تدوین کے آرزو مند تھے۔۔۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم تعلیمی اداروں میں سیرت وہ اسلوب یا ڈھانچہ تیار کیا جا سکے جو دور حاضر میں خالصتاً مسلم کردار کی تشکیل میں ممد ثابت ہو سکے۔"(۲)

غرض اقبال کے تمام تر تصورات کا محور احیائے ملت و احیائے اسلام تھا بقول خلیفہ عبد الحکیم:

"۱۹۰۸ سے لیکر عالم جاودانی کو سدھارنے تک اقبال کی شاعری میں بے شمار فلسفیانہ افکار اور حکیمانہ جواہر ریزے بھی ملتے ہیں لیکن سب کا محور تعلیمات اسلامی اور جذبہ احیائے ملت ہے۔"(۳)

اس غلط فہمی کا امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ احیائے ملت سے وابستہ ہو کر اقبال اپنے آپ کو ملت اسلامیہ تک محدود کر لیتے ہیں۔ دراصل اقبال کے نزدیک اسلام ان بنیادوں، اصولوں اور اخلاقیات کا قابلِ عمل مجموعہ ہے جو بنیادی ہونے کے ساتھ اس قدر حرکی، اور انسانی ہیں کہ مختلف ملتوں کو تمام فطری امتیازات کے باوجود اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ اس لیے اقبال اسلامی بین الاقوامیت سے دراصل انسانی بین الاقوامیت کی طرف بڑھے ہیں بقول عزیز احمد:

"اقبال کے نزدیک اسلام کا تصور مذہبی گروہ بندی نہیں۔ بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں اور ایک دوسرے کی شخصیت کو تسلیم کر لیں۔"(۴)

اسی طرح اقبال نے وطنیت سے ملت کی طرف سفر طے کیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وطن کی محبت ان کے دل سے محو ہو گئی انھوں نے تو محض:

"سیاسیات کو وطن سے علیحدہ کر کے مذہبی تمدن سے منسلک کر دیا۔ اقبال کی شاعری کی جذباتی سطح پر وطن اور مذہب دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہے صرف سیاسیات نے ایک سے قطع تعلق کر کے دوسرے سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔"(۵)

اس طرح وطن کی سیاسی محبت جغرافی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ دور سوم کے متعلق جتنی بحث اب تک کی گئی یہ ۱۹۱۱ سے ۱۹۲۴ تک میں بھی (ہمارا زیر بحث موضوع) موجود ہے۔ اس دور کی نظموں میں، "شکوہ"، "جواب شکوہ"، "شمع و شاعر"، "خطاب بہ نوجوانان اسلام"، "حضور رسالت مآب میں"، "تعلیم اور اس کے نتائج، شاعر"، "دعا"، "فاطمہ بنت عبداللہ"، "ارتقاء"، "والدہ مرحومہ کی یاد میں"، "مذہب"، مسلمان اور تعلیمِ جدید"، "پیوستہ رہ شجر سے"، "اسیری"، "دریوزہ خلافت"، "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" وغیرہ نظمیں ان تمام رویوں کی تصدیق کرتی ہیں جن کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح فارسی شاعری میں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اور پیام مشرق کے مجموعے دیکھے جا سکتے ہیں۔ دیباچہ ہائی اسرار و رموز، "اسرار خودی اور تصوف"، "اسرار خودی"، "تصوفِ وجودیہ"، "جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ"، دیباچہ پیام مشرق اس دور میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۱۱۔ ۱۹۱۰ میں ان کا مضمون "اسلام میں سیاسی فکر" شائع ہوا جس سے ان کے نظریہ خلافت پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۹۱۱ ان کی زندگی کا اہم ترین سال ہے اس اعتبار سے کہ اس سال سے انہوں نے احیائے ملت کا فیصلہ کن ارادہ کر لیا۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:

"یہ سال اقبال کے ذہنی و فکری ارتقاء اور جذبات ملی کی ترجمانی کے لحاظ سے فیصلہ کن کہا جا سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ علی گڑھ کے بعد انہوں نے خدمت قومی کے میدان میں اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کے ساتھ سرگرم عمل ہونے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔"(۶)

اس دور میں تقسیم بنگال ہوئی اور ہندی مسلمانوں پر ایک شدید ضرب پڑی۔ مسلمانانِ عالم کی پست حالی ہر جگہ یکساں تھی ۔ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر یورپی و غیر ملکی استعمار کے زیر تسلط پس رہے تھے۔ برائے نام آزاد مسلم ممالک بھی تباہی کے دوراہے پر تھے۔ یورپی وطینت خود یورپی اقوام میں مظالم اور رقابت پیدا کر رہی تھی اور اس کے اثرات مسلمان ممالک تک پہنچ رہے تھے۔ برصغیر کے مسلمان بھی ہر لحاظ سے پسماندہ تھے، بے عملی، تقدیر پرستی، ذہنی، سیاسی، معاشی غلامی ان کا مقدر ہو چکی تھی، اسلامی تشخص مٹ رہا تھا، غرض تمام عالم اسلام کسمپرسی کا شکار تھا۔ قومیت وطینت پرستی کے جوش میں جنگ عظیم کا خطرہ بڑھ رہا تھا لیکن اس سے قبل یہ ملبہ جنگ بلقان و جنگ طرابلس کی صورت میں مسلمانوں پر آ گرا۔ اور یورپ کے جارہانہ عزائم کی تکمیل شروع ہوئی۔ اس الم انگیز صورتحال نے مسلمانوں کو از حد متاثر کیا۔ اس تمام پس منظر میں اقبال کے افکار نے ایک نئی کروٹ لی اور کئی مؤثر نظمیں تخلیق کیں۔ جو اس تمام پس منظر اور جنگ بلقان سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھیں۔ مثلاً "شکوہ"، "جواب شکوہ"، "شمع وشاعر"، "فاطمہ بنت عبداللہ"، "غرہ شوال"، "محاصرہ ادرنہ"، "مسلم"، "نوید صبح"، "حضور رسالت مآب میں"، "خطاب بہ جوانان اسلام" وغیرہ۔

غرض ۱۹۱۱ میں اقبال بھی اپنے گردونواح سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ ذاتی محرومیوں، مسلمانان ہند کی مایوسیوں اور دنیائے اسلام پر نازل ہوتی ہوئی پے در پے مصیبتوں کے رد عمل کے طور پر انھوں نے شکوہ میں مسدس ہیئت میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کے ساتھ ان کی موجودہ خستہ حالی کو بارگاہ الٰہی میں بطور شکایت پیش کیا۔ ایک طرف یہ احساس ان کے دل میں جاگزیں ہے کہ مسلمان امتِ رسول نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ احساس کہ یہ امت زوال پذیر ہے۔ اسی متضاد احساس سے شکوہ نے جنم لیا ہے۔ اس طرح یہ نظم بقول رفیع الدین ہاشمی: "عام مسلمانوں کے لاشعوری احساسات کی ترجمانی ہے۔"(۷) شکوہ میں مسلمانوں میں ذوق عمل پیدا کرنے کے لیے، اسلامی تشخص اجاگر کرنے کے لیے، اتحاد واتفاق کے لیے، آزادی کے لیے، بالکل نیا اور یگانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ بقول مولانا غلام رسول مہر:

> "شکوہ ہمیشہ ناخوش گوار حالات کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن نظم پڑھنے کے دوران ہرگز احساس نہیں ہوتا کہ مسلمان ناخوشگوار حالات سے دوچار ہیں عظیم الشان کارنامے اس حسن ترتیب سے جمع کر دیے گئے ہیں کہ موجودہ پست حالی کی بجائے صرف عظمت وبرتری ہی سامنے رہتی ہے گویا یہ شکوئہ بھی ہے اور ساتھ ہی بہترین دعوتِ عمل بھی۔ اس لحاظ سے یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی بالکل یگانہ نظم ہے"(۸)

فنی اعتبار سے بھی یہ نظم بے نظیر ہے۔ بقول عابد علی عابد:

> "اس کی ساخت میں اقبال نے پہلی بار اس صنعت گری کی ایک جھلک دکھائی ہے جسے بعد کی نظموں میں عروج کمال پر پہنچنا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس نظم میں محسنات شعر کا استعمال ایسی چابکدستی اور ہنرمندی سے ہوا ہے کہ پڑھنے والی کی توجہ بیشتر مطالب پر ہی مرکوز رہتی ہے۔"(۹)

''جوابِ شکوہ''، ''شکوہ'' کا جواب ہے۔ ''شکوہ'' میں بارگاہِ الٰہی میں شکایت نامہ پیش کیا گیا تھا ''جوابِ شکوہ'' میں ان شکایات کے جوابات ہیں۔ زوالِ مسلم کے اسباب کی نشاندہی اور توجیہہ کی گئی ہے گویا زوال یافتہ مسلمانوں کو ابھرنے کے طریقے بتلائے گئے ہیں جن میں عشقِ رسول، اتحاد و اتفاق عمل، اسلامی تشخص کی بحالی، فرقہ پرستی کا خاتمہ، یورپ کی اندھی تقلید سے گریز وغیرہ کا اظہار ہے۔ دراصل یہ نظم ''شکوہ'' پر اعتراض کے جواب میں لکھی گئی۔ جس پر گستاخانہ اسلوب اور انداز کا اعتراض کیا گیا تھا۔ اس طرح یہ نظم ''شکوہ'' کا جواب ہے۔ اس میں بعض اشارات تاریخ اسلامی اور جنگ بلقان کے بھی ملتے ہیں۔ ''جوابِ شکوہ'' فنی اعتبار سے بھی حسن کا پیکر ہے۔ سید عابد علی عابد اس کے اختصار اور موضوع کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> '' جواب شکوہ میں بارگاہِ ربانی سے مسلمانوں کی شکایات کا جواب ملتا ہے ان کی زبوں حالی کی توجیہہ ملتی ہے ان کی زباں کاری کے اسباب کی نشاندہی کی جاتی ہے ان کے زوال کا کھوج لگایا جاتا ہے اور ایسی پستی ایسی بلندی کے رموز حل کیے جاتے ہیں۔ بارگاہِ ربانی سے جو جواب ملتا ہے باوجود متنوع کوائف کے نہایت مختصر ہے''(۱۰)

اس طرح ''شکوہ''، ''جواب شکوہ'' میں جرات مندانہ لیکن باادب شکایت سے اقبال کی شاعری میں بندے اور خدا کے اس تعلق کا آغاز ہوتا ہے جس کی بنا عبدیت اور بے تکلف و باادب محبت پر ہے دونوں نظموں کا ایک ایک بند درج کیا جاتا ہے۔

''شکوہ''

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں　　فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں　　ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

''جواب شکوہ''

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری　　مرے درویش، خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوائے اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری　　تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

''شمع و شاعر'' بھی اسی دور کی (یعنی جنگِ طرابلس، جنگِ بلقان کے دوران لکھی جانے والی) اہم نظم ہے۔ یہ نظم بھی دیگر نظموں کی طرح تمثیلی اور مکالماتی نظم ہے جس میں شمع و شاعر کا مکالمہ ہے۔ شمع دراصل سوزِ دروں کا خارجی مظہر ہے۔ ہدایت اور نور کی علامت ہے۔ یہ سراسر علامت اور رمزیہ انداز میں ڈوبی ہوئی نظم ہے اور فلسفہ و شعر کا حسین امتزاج ہے۔ شمع کے ذریعے احیائے ملت و اسلام کا پیغام ہے۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:

"یہ نظم ملت اسلامیہ کی اس وقت کی صورتحال کے فکر انگیز تجزیے، خود شناسی
کے احساس و پیغام اور اپنے رجائی نقطہ نظر کے اعتبار سے اقبال کے فکر و فن میں
ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔"(۱۱)

اس نظم میں تخلیقی کاوشوں کے محرکات اور شعر گوئی کے مقاصد کا ذکر بھی ہے اس ادبی نصب العین کا ذکر ہے جس کا تعین یورپ میں کیا گیا تھا۔

کہہ گئے ہیں شاعری جزوبست از پیغمبر ی
ہاں سنادے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

چنانچہ اس میں پہلے بند کے بعد دوسرے تیسرے، چوتھے اور پانچویں بند میں ملت اسلامیہ کی بربادی کا نقشہ ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

لیکن چونکہ اس سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے جبکہ وقت ملت کو بیدار کرنے کا ہے اس لیے چھٹے، ساتویں، آٹھویں، نویں، دسویں بند میں شاعری کو پیغمبری کا جزو قرار دے کر قوم کو از سر نو عروج حاصل کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ ایمان، عمل، خودی، اجتماعی خودی، عشقِ رسول، اتحاد کا درس دیا گیا ہے۔ گیارہویں بند میں آئندہ حالات کی پیشین گوئی ہے۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلو ہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" بھی اسی دور کو پیش کرتی ہے۔ اس میں ایک گیارہ بارہ سالہ معصوم بچی کی شہادت کو پیش کیا گیا ہے جو غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے میدان کارزار میں شہادت یاب ہوئی۔ اقبال نے نہ صرف اس واقعہ کو زندہ جاوید بنا دیا ہے بلکہ اس کی عظیم قربانی سے نئی سحر کے طلوع ہونے کی پیشین گوئی کی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کو خاکستر سے تشبیہ دی ہے۔ اس لیے کہ قوم میں جوشِ عمل باقی نہیں رہا۔ مگر اقبال مایوس ہونے کی بجائے یہ پیغام دیتے ہیں کہ اسی خاکستر میں فاطمہ جیسی چنگاری یعنی نوجوان موجود ہیں جو قوم کی ڈوبتی کشتی کو کنارے لگائیں گے۔

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغو ش میں

"حضور رسالت مآب میں" بھی جنگ طرابلس سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ شاعر نے اس میں "حضور رسالت مآب میں" حاضر ہو کر طرابلس کے شہیدوں کا لہو آپ کا نذر کیا ہے کہ دہر میں آسودگی، وفا اور وہ زندگی جس کی تلاش ہے نہیں ملتی اس لیے آبگینے میں شاعر ایسی چیز لے کر جاتا ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی، وہ امتِ رسول کی آبرو ہے۔ طرابلس کے شہیدوں کے لہو کی صورت میں:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں　　طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

گویا اس میں امت کی آبرو اور لاج رکھنے اور عروج رفتہ عطا کرنے کی درخواست ہے۔ "غرہ شوال یا ہلال عید" زوالِ امت اور مسلم ممالک کی تباہ حالی پر الم و غم کا شدت سے اظہار ہے۔ مغرب کی چیرہ دستیوں کا ذکر ہے۔ مغرب کے عروج اور مسلمانوں کے

طور طریقے اپنانے اور ملت اسلامیہ کے زوال کا ذکر ہے۔ غرض اس میں مغرب کا عروج جو انہوں نے مسلمانوں سے سیکھا ہے اس کا ذکر ہے اور مسلمانوں جو آبرو یافتہ تھے ان کے بے آبرو ہونے کا ذکر ہے۔

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اوراپنے مسلموں کو مسلم آزاری بھی دیکھ
صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرورِ دوش رہ

''محاصرہ ادرنہ''، ''نویدِ صبح''، ''مسلم'' وغیرہ میں بھی عالم اسلام کے لیے ''شمع و شاعر'' کی طرح امید افزاء پیغام اوران کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی ہے۔

''نویدِ صبح''

مسلمِ خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آراء تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق گرم تقاضا تو بھی ہو

''مسلم''

سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

''خطاب بہ جوانان اسلام'' میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر کیا ہے۔ اور جوانانِ اسلام کا زوال پیش کیا ہے جو اپنے اسلاف کے علم و حکمت کے موتی بھلا بیٹھے ہیں۔ نوجوان کے آباء ''کردار''، اور ''سیار'' تھے مگر نوجوان ''ثابت'' اور ''گفتار'' ہے۔ اسلاف کی میراث گنوادی گئی ہے۔ حکومت کا تو کیا رونا وہ عارضی شے تھی، آج کسی کے پاس کل کسی کے پاس، مگر علم کے موتی اور کتابیں یورپ میں نظر آتی ہیں تو دل سیپارا ہوتا ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

مراد یہ کہ کتابیں ہماری تھیں جن سے اہل مغرب نے فائدہ اٹھایا، ان کی تمام تر سائنسی ترقی، ٹیکنالوجی اور مادی ارتقاء کی بنیاد ہمارے آباء کے علوم و فنون پر ہے۔ دراصل اقبال قدیم و جدید تعلیم کی ہم آہنگی کے قائل ہیں ان کے نزدیک یورپ نے ہماری قدیم تعلیم سے استفادہ کر کے جدید تعلیم کا آغاز کیا۔ یہی عمل مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ آباء و اسلاف کی کتابوں اور یورپ کی جدید علمی ترقی کے حصول سے اسلامی سیرت کا ڈھانچہ تشکیل دیں۔ بانگ درا کے تیسرے دور کی ایک اہم نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' ہے جو اقبال نے اپنی والدہ کی وفات کے بعد ان کی یاد میں لکھی۔ دراصل یہ نظم ایک مرثیہ ہے جس میں اقبال کی والدہ سے محبت اور یادوں کا اظہار دو طرح ہوا ہے۔ (i) فلسفہ حیات و ممات اور جبر و قدر، (ii) والدہ سے وابستہ یادیں اور وفات پر رد عمل، اس طرح اس نظم میں جذبہ اور فکر دونوں ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ فلسفہ حیات و ممات میں زندگی کو ابد قرار اور دائمی قرار دیا ہے۔

موت تجدیدِ مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جوہرِ انسان　　عدم　　سے　　آشنا　　ہوتا　　نہیں
آنکھ　　سے　　غائب　　توہوتا　　ہے　　فنا　　ہوتا　　نہیں

چنانچہ ماں نے بھی موت کے پردے میں دائمی حیات حاصل کی ہے اسی لیے وہ شدید حرماں کا تصور جو نظم کے آغاز میں تھا آخر میں جذبہ مسرت میں بدل جاتا ہے اور اس دعا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

آسماں　　تیر　　ی　　لحد　　پر　　شبنم　　افشانی　　کرے
سبزۂ نورستہ　　اس　　گھر　　کی　　نگہبانی　　کرے

بقول وقار عظیم:

"والدہ مرحومہ کی یاد میں اقبال کی ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبال کی شخصیت دو مختلف اندازوں میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ ایک شخصیت تو اقبال کی وہی فلسفیانہ شخصیت ہے جس کی بدولت اقبال کو اردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت ملی ہے اور دوسری شخصیت اس مغموم و مجبور انسان کی ہے جو ماں کی یاد میں آنسو بہاتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ایک مفکر اور فلسفی بھی ہے۔"(۱۲)

۱۹۱۵ میں ان کی مثنوی "اسرارِ خودی" شائع ہوئی۔ اسرارِ خودی کا ایک خاص پس منظر ہے۔ قیام یورپ کے دوران انہوں نے اسلامی فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اس کے ساتھ یورپی تہذیب کا مشاہدہ بھی کیا۔ اس کے سبب انہوں نے نہ صرف ملوکیت، وطینت، استعمار اور خالص مادیت کو رد کیا بلکہ وحدت الوجودی تصوف سے بھی منحرف ہو گئے۔ افلاطونی فلسفہ نے تصوف کی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کے قوائے عمل کو شل کر دیا۔ پھر اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مسلسل آلام نے ترک دنیا کے ذریعے وحدت الوجودی تصوف کو فروغ دیا اور مسلمان کے مجہولیت کی عملی تصویر بن کر رہ گئے۔ چنانچہ مسلمانوں کے زوال کا باعث وہ وجودی تصوف ہے جو افلاطون کے ذریعے ایرانی شاعری میں در آیا اور قوم کو نفی خودی اور بے عملی کا نمونہ بنا دیا۔ نتیجتاً یورپ کی قومیں ذوق عمل، سائنس اور ٹیکنالوجی کے بل پر مسلم اقوام پر چھا گئیں۔ چنانچہ انہوں نے قوم میں خودی و عمل اور بیداری پیدا کرنے کے لیے غیر اسلامی، غیر قرآنی تصوف کو رد کر کے اپنا نظریہ خودی باقاعدہ طور پر اسرار خودی کی شکل میں پیش کیا۔

پہلے انھوں نے اس کو اردو میں لکھنا شروع کیا مگر مطالب کی ادائیگی نہ ہونے پر اور ابلاغ کی دقتوں کے سبب فارسی کو وسیلہ بنایا۔ فارسی اختیار کرنے کا ایک سبب تو یہی ہے کہ فارسی میں صوفیانہ و فلسفیانہ خیالات ادا کرنے کی صلاحیت ان کے نزدیک زیادہ تھی۔ دوسرے فارسی کئی ممالک میں رائج تھی اس لیے ان کے خیالات برصغیر سے باہر بھی جاسکتے تھے۔ اقبال کی فارسی شاعری کے موضوعات اور محاسن واوصاف وہی ہیں جو اردو شاعری کے ہیں، البتہ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے فارسی کلام زیادہ ہے اور اثر پذیری بھی شدید ہے۔ اقبال سب سے زیادہ رومی سے متاثر ہیں چنانچہ اسرار خودی اور رموزِ خودی کی بحر بھی مثنوی معنوی والی ہے۔ بلکہ ان کی پوری شاعری کا ڈھانچہ رومی ہی کا ممنونِ احسان ہے۔(۱۳) بقول عبد القادر سروری:

"سچ یہ کہ اسرار خودی مولانا روم اور ان کی مثنوی ہی متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اسرار خودی کے اشعار میں جو کیف و مستی اور عمق و شائستگی نظر آتی ہے وہ

ان ہی کا فیضان نظر ہے چنانچہ مثنوی کے آغاز ہی میں اس قسم کا اظہار مل جاتا ہے کہ خودی کا راز ان پر دراصل مولانائے روم نے فاش کیا ہے۔"(۱۴)

مثنوی کی اشاعت سے ایک سال قبل اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنا مقالہ "عملی تصوف اور اسلام" پڑھا جس میں عجمی تصوف کی غیر اسلامی حقیقت اس کے بے عمل اور فنائی ہونے کے ثبوت میں عجمی خودی سے بحث کی گئی اور بتایا گیا کہ عجمی تصوف اسلامی تصوف کے قطعاً خلاف ہے اور یہ کہ اس میں خودی کا مفہوم فنا کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے جو ترک عمل کا موجب ہے اور تصوف کے بجائے حفظِ خودی پر زور دیا اسی خطبے میں انہوں نے "اسرار خودی" کے عنقریب شائع ہونے کا اعلان کیا جو عجمی تصوف کے طلسم کو پاش پاش کر دے گی گویا یہ خطبہ "اسرارِ خودی" کی اشاعت اور عجمی تصوف کو ترک کرنے کا اعلانیہ تھا۔(۱۵)

۱۹۱۵ میں مثنوی منظر عام پر آئی۔ مثنوی کے پہلے ایڈیشن میں دیباچہ بھی تھا۔ جو اردو میں اقبال کے موئے قلم سے تھا۔ اس میں فلسفہ خودی کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور اس دقیق مسئلے پر اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ تصور خودی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور تصور خودی کی وضاحت کے لیے لفظ خودی کی وضاحت کی ہے خودی کی ماہیت کو بیان کیا ہے۔ لفظ خودی کے متعلق لکھتے ہیں:

" یہ لفظ نظم بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے ۔"(۱۶) اس میں شامل خودی کے تاریخی خاکے کے متعلق ان کا بیان ہے:

> "یہ ہے ایک مختصر خاکہ اس مسئلے کی تاریخ کا جو اس نظم کا موضوع ہے۔ میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ پیچیدگی سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو ۔اس دیباچے سے اس نظم کی تفسیر مقصود نہیں محض ان لوگوں کو نشانِ راہ بتلانا مقصود ہے جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت کی دقتوں سے آشنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سطورِ بالا سے کسی حد تک یہ مطلب نکل آئے گا۔ شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کہ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت، اس کے ثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے میں کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔"(۱۷)

اسی دیباچہ کے بالکل ابتدا میں لکھتے ہیں:

> "یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نکتہ جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمنیات مُستیز ہوتے ہیں یہ پر اسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافتِ مشاہدہ کرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی۔"(۱۸)

غرض اس دیباچے سے اقبال کے تصورِ خودی، تصوف، خودی کی ماہیت، نوعیت، اہمیت، خودی کی تاریخ، تصوف کی شاعرانہ تاریخ کے حوالے سے آگاہی ہوتی ہے۔ اسرار خودی کا موضوع ظاہر ہے فلسفہ خودی ہے جسے اجاگر کرنے کے لیے اقبال نے اس مثنوی کو کئی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے ابتداء میں رومی کے اشعار ہیں۔ تمہید میں پس منظر کے طور پر کرب روح کا ذکر کرکے مولانا روم سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے ہے۔ پھر بتایا کہ استحکامِ کائنات استحکام خودی سے ہے۔ مزید بتایا ہے کہ خودی اعلیٰ مقاصد اور عشق و عمل سے مستحکم ہوتی ہے۔ ذاتی اغراض و مقاصد، سوال، دنیاوی حرص و طمع اور تقلید سے خودی ضعیف ہوتی ہے البتہ اعلیٰ مقصد سے سرشار ہو کر تخلیق آرزو کے ذریعے کار جہانبانی کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ پھر ایک حکایت بیان کی ہے جس میں گوسفند کا ذکر ہے۔ اس سے اقبال کا مقصد یہ ہے کہ افراد اور قومیں کس طرح محکومانہ ذہنیت کا شکار ہو کر اپنی خودی کھو بیٹھتی ہیں اور بے عملی و غلامی کو ترجیح دینے لگتی ہیں۔ افلاطونی فلسفہ حیات، تصوف کے نام پر چونکہ حیات کے سرچشموں کو خشک کرتا ہے اور اس نے ملت اسلامیہ کے ادبیات اور افکار پر گہرا اثر ڈالا ہے اس لیے اس قسم کے شعراء کو "گروہِ گوسفندان قدیم" اور افلاطون کو "راہبِ دیرینہ" میں شمار کیا ہے۔ اسی سلسلے میں ادبیات کی اصلاح اور حقیقت شعر پر روشنی ڈالی ہے اور عجمی کی بجائے عربی انداز اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ اسکے بعد خودی کی تربیت کے لیے اطاعت، ضبط نفس اور نیابتِ الٰہی کے مراحل بتائے ہیں جن سے گزر کر انسانِ کامل وجود میں آتا ہے۔ اس کے بعد خودی اور اس کی تعمیر سے متعلق باتیں دراصل اس کی مزید تشریح کرتی ہیں۔ اہل خودی کے واقعات لکھے ہیں جن سے مقصود خودی کی ماہیئت، کارنامے اور ابدی حیات کے نکات کا بیان ہے۔ آخر میں دلسوز دعا ہے کہ کاش اس کے کرب و درد کو لوگ سمجھ سکیں اور اس کی تنہائی کو انجمن میسر آجائے۔ مثنوی کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں :

زندگانی را بقا از مدعاست　　کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم
راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم　　از گروہِ گوسفندان قدیم
گفت سرِ زندگی در مُردن است　　شمع را صد جلوہ از افسردن است
گوسفندی در لباسِ آدم است　　حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است
منکرِ ہنگامہ موجود گشت　　خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
اے سوارِ شہبِ دوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو　　در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

اسرارِ خودی میں چونکہ حافظ کی شاعری اور وحدت الوجودی تصوف پر اعتراض کیا گیا تھا اس لیے اسرارِ خودی پر بے شمار اعتراضات کیے گئے۔ اور معرکہ آرائی کا سماں پیدا ہو گیا۔ خود اقبال نے تصوف، خودی اور حافظ کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے خطوط اور مضامین لکھے۔ مضامین میں " اسرار خودی اور تصوف"، "سر اسرارِ خودی"، "علمِ ظاہر و علمِ باطن"، "تصوفِ وجودیہ" وغیرہ لکھے گئے۔ بقول فرمان فتح پوری:

"خودی، بے خودی تصوف اور شریعت کے بارے میں علامہ اقبال کی اس قسم کی
وضاحتیں ان کے فلسفہ حیات اور کلام کو سمجھنے سمجھانے میں بڑی معاون ثابت

ہوئیں اور اقبال کے معترضین آخر اقبال کی جانب سے مطمئن اور ان کے نقطہ نظر
کے قائل ہو گئے۔"(۱۹)

ان کا پہلا مضمون "اسرار خودی اور تصوف" ہے جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ وہ تصوف کے نہیں بلکہ غیر اسلامی مسائلِ تصوف کے مخالف ہیں۔ مثلاً وحدت الوجود کے تمام مسائل قرآن کے مطابق نہیں۔ خدا تعالیٰ نظام عالم میں جاری اور ساری نہیں بلکہ ان میں خالق و مخلوق کا رشتہ ہے۔ اسلامی لٹریچر بیشتر مضر فلسفیانہ و متصوفانہ اخلاق سے پُر ہے۔ بالخصوص فارسی لٹریچر۔ بقول اقبال، حافظ کی شاعری شاعرانہ اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ بحیثیت شاعر اقبال اس کے مخالف نہیں۔ البتہ ان کے نزدیک حافظ شاعر ہی نہیں بلکہ سب سے بڑے ساحر ہیں۔ وہ فن کے اعتبار سے ایشیا کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ تاہم ان کا نصب العین قرآنی نصب العین کے برعکس ہے۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ ان کی تنقید حافظ کے فن یا شخصیت پر نہیں ہے بلکہ ان کے نصب العین پر تنقید کرنا مقصود ہے۔ ان کا نصب العین حالتِ سُکر پیدا کرتا ہے۔ اس لیے ان کی مخالفت نظریاتی ہے۔(۲۰)

اپنے مؤقف کی وضاحت کے سلسلے میں ان کا دوسرا مضمون "سرِ اسرار خودی" ہے جو انہوں نے خواجہ حسن نظامی کے اعتراضات کے جواب میں لکھا۔ اس میں انہوں نے اپنا عقیدہ بیان کیا ہے کہ اسلام دین و دنیا کے فرائض کو یکجا کرتا ہے لیکن جس طرح خواجہ حسن نظامی نے اسلام کی تعبیر کی ہے اس طرح اسلام اور رہبانیت میں فرق نہیں رہتا۔ اقبال کہتے ہیں کہ ان کا فلسفہ حقتہ اسلامیہ ہے نہ کہ فلسفہ مغرب۔ ان کے نزدیک مغربی فلسفہ وحدت الوجود ی ہے۔ پھر ان لغزشوں اور اعتراضات کی نشاندہی کر کے ان کے جوابات دیے ہیں۔ مثلاً جواب دیتے ہیں کہ عجمی تصوف جزِ و اسلام نہیں یہ رہبانیت ہے، تحریک تصوف کو مٹانا ان کا مقصد نہیں بلکہ حفظِ اسلام ہے۔ اور یہ کہ یورپ کی تقلید مقصود نہیں بلکہ استفادہ مقصود ہے کہ علمی ترقی تاریخِ اسلامی کی قطعی صداقت کا ثبوت ہے کہ اور یہ کہ مولانا رومی کی مثنوی میں وحدت الوجود نہیں بلکہ اسلامی تصوف یا وحدت الشہود ہے وغیرہ۔(۲۱)

غرض اس مضمون کے ذریعے انھوں نے حافظ کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ نظریہء خودی و تصوف کی وضاحت کی ہے اور یورپ کی علمی ترقیوں کی حقیقت اور استفادے کا طریقہ کار بیان کیا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اور مضمون "علمِ ظاہر و علمِ باطن" ہے اس میں واضح کیا ہے کہ ان کے نزدیک وہ تصوف عینِ اسلام ہے جس کا نصب العین شعائرِ اسلام یا عمل میں اخلاص اور مخلصانہ استقامت پیدا کرنا ہو۔ اس طرح شریعت و طریقت ہم آہنگ ہیں اور شریعت کی پُرخلوص اطاعت کا نام اسلامی تصوف ہے مگر تصوف کے ایک گروہ نے شریعت کو "ظاہر" کا نام دے کر اسلام کی جڑ تصوف کو قرار دیا ہے ایسا تصوف جس سے مراد باطنی دستورالعمل ہے جس کا شریعت سے تعلق نہیں۔ اس گروہ کے نزدیک یہی تصوف معرفتِ الٰہی کا وسیلہ ہے حالانکہ یہ نظریہ و عمل رہبانیت کی جڑ ہے جبکہ صوفیاء کے خیال میں معرفت یا علمِ باطن ایک مرتب دستورالعمل ہے جو شریعت اسلامیہ سے مختلف ہے۔(۲۲)

غرض اس مضمون کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ اسلام ظاہر و باطن، علم و عمل، خلوص و اخلاص یا شریعت کے مجموعے کا نام ہے بلکہ "شریعت" ہی میں سب کچھ ہے اسی لیے شریعت کی اقتداء ہی عین اسلام ہے۔ ایک مضمون "تصوف وجودیہ" ہے۔(۲۳) جس میں اقبال نے حضور کی اس پیشین گوئی پر بحث کی ہے کہ تین قرنوں کے بعد میری اُمت میں سمن کا ظہور ہو گا۔ اسی طرح ایک اور مضمون "اسلام اور تصوف" بھی معرکہ اسرار خودی کے زمانے کا ہے۔(۲۴) اس میں ثابت کیا ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات میں کوئی مخفی چیز، نہیں کوئی اصول مخفی نہیں۔ اسی لیے اقتدار اور غلامی کا انحصار اسی عقیدہ توحید و رسالت کے اختیار کرنے کے پر ہے۔ اسلام کے احیاء کا انحصار ، اسلام کے غلبے کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصلحانہ انداز میں توحید کے اصول کو اپنایا جائے اور عجمی تصوف جو توحید کے

سراسر خلاف ہے اس سے نکل کر عرب یا خالص توحید کی فضا میں آیا جائے۔ مندرجہ بالا جائزہ سے تصوف وجودیہ کی مخالفت کے اسباب، تصور خودی، اسلام کی حقیقت، رہبانیت و عمل، شریعت و طریقت، انسانی بقاء وغیرہ کے نظریات واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں ۔بقول عابد علی عابد:

> "تفصیل اس اجمال کی یہ ہے اقبال انسانی انا کے ارتقاء کے قائل ہیں۔ عجمی صوفیا کی طرح وہ تکمیل ذات اسے نہیں کہتے کہ انائے انسانی ایک قطرہ حقیر کی طرح انائے مطلق کی وحدت کے بحرِ بے پایاں میں جذب ہو جائے، بلکہ اسے کہتے ہیں کہ اپنے اندر جہاں تک ہو سکتا ہے صفات ربانی پیدا کرے، تسخیر کائنات کا فریضہ سرانجام دے اور تخلیق میں خدا کا ہم باز ہو۔"(۲۵)

"رموز بے خودی" اقبال کی دوسری فارسی تصنیف ہے۔ یہ دراصل "اسرار خودی" کا تتمہ ہے۔ بلکہ الگ الگ کتابوں کی صورت میں شائع ہونے کے باوجود ایک ہی موضوع کی دو کڑیاں ہیں۔ ان دونوں کا خاکہ اقبال کے ذہن میں ایک ساتھ تیار ہوا تھا۔ مگر کوشش کے باوجود ایک ساتھ شائع نہ ہو سکیں۔ "اسرار خودی" کی طرح پہلی اشاعت میں "رموز بے خودی" کا دیباچہ بھی تھا مگر بعد میں خارج کر دیا گیا اب یہ مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبد الواحد میں موجود ہے۔(۲۶) اس دیباچے میں رموزِ بے خودی کی اہمیت اور موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

> " جس طرح حیاتِ افراد میں، احساسِ نفس کے تدریجی نشوونما اس کے تسلسل توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر قومی انا کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئین مُسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کیے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔"(۲۷)

"اسرارِ خودی" میں فرد کی خودی کی نشوونما، ارتقاء، مراحل اور تعمیر و تربیت کے اصول و ضوابط سے بحث ہے رموز بے خودی میں فرد سے آگے بڑھ کر پوری ملت یا قوم کی خودی کی تربیت وارتقاء اور تسلسل و استحکام پر بحث کی گئی ہے۔ فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق پر بحث ہے۔ مغرب کی قومیت پرستی کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی فرد کمال تک پہنچنا چاہے تو اس کے لیے ایک باشعور، خوددار اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر مبنی ملت یا معاشرے کی ضرورت ہوگی۔ ملت اسلامیہ اقبال کے نزدیک ایسی ملت ہے جو توحید و رسالت پر اپنا مدار رکھ ہر رنگ و نسل، زبان اور مکان کی سختیوں اور پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہے یہ محض نظریہ نہیں بلکہ ہر طرح سے قابلِ عمل فلسفہ حیات ہے۔ اس میں تمیزِ بندہ و آقا گھناؤنا جرم ہے اس کا نظام مساوات، آزادی، عدل، انفرادی ترقی اور بے خوف زندگی بسر کرنے اصولوں پر مبنی ہے اس میں محمود و ایاز ایک ہی آئین کے پابند ہیں۔ " بے خودی" اقبال کے نزدیک فنا نہیں بلکہ فرد کا اجتماعیت میں بدلنا، اپنے مقاصد کو معاشرے کے مقاصد پر ترجیح دینا بے خودی ہے۔

" اقبال قطرہ و دریا کی تمثیل سے فرد و ملت کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہو جاتی بلکہ اور استحکام حاصل کر لیتی ہے وہ بلند اور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے اس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اس کی خودی پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔"(۲۸)

یہی تمام تر بحث "رموزِ بے خودی" کا موضوع ہے "اسرار خودی" کی طرح مولانا روم کا ایک شعر بطور انتساب درج ہے۔

جہد　　کن　　در بیخودی　　خود　　را بیاب
زود　　تر و　　اللہ　　اعلم　　باتصواب

آغاز میں ملت اسلامیہ کو مخاطب کیا ہے پھر ربطِ فرد و ملت پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر بتایا ہے کہ ملت افراد کے ارتباط و اختلاط سے وجود میں آتی ہے اس کی تربیت و تکمیل نبوت کی رہنمائی میں ہوتی ہے۔ اقوام کی تقلید کے لیے ملتِ اسلامیہ ہے جس کی بنیاد عقیدہء توحید پر ہے۔ رسالت محمدیہ کا اصول اور مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں حریت و مساوات اور اخوت کی قدروں کو فروغ دے۔ حکایت بو عبیدہ و باجان، حکایتِ سلطان و معمار، حادثۂ کربلا کے ذریعے تعمیرِ ملت کی منزلوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ چونکہ ملتِ اسلامیہ کی اساس توحید و رسالت پر ہے اس لیے وہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماورا اور منزا ہے۔ جغرافیائی تاریخی حالات اور نسلی علاقائی اور وطنی تعصب اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ملتِ اسلامیہ کی اساس وطن اور نسل پر نہیں آئین قرآن و محمد پر ہے۔ اس کا نظام حیات لچکدار ہے۔ اجتہاد اس کا سر کردہ اصول ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی سیرت اسی نظام سے پختہ ہوتی ہے۔ فرد کی طرح ملت کی بھی ایک خودی ہوتی ہے جو ملی روایات و ضوابط کو برتنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آخر میں خلاصہء مطالبِ مثنوی کے عنوان سے سورہء اخلاص کی منظوم تفسیر ہے اور نعتیہ اشعار بطور مناجات شامل ہیں۔

اقبال کا خودی و بے خودی کا تصور اور ملتِ اسلامیہ کے لیے نظام حیات قرآن و رسالت سے اخذ کردہ ہے جیسا کہ اسرار و رموز پر تبصرہ سے واضح ہے۔ اگرچہ دیگر یورپی و مغربی مفکرین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مگر اس کی حیثیت استفادے کی ہے۔ مثنوی رموزِ بے خودی کی اشاعت سے ان کا تمام فلسفہ واضح ہو کر سامنے آ گیا۔ اعتراضات رفع ہو گئے۔ تشنگی ختم ہو گئی۔ مشرق و مغرب میں ترجمے ہونے لگے اور ان کے انقلاب آفریں خیالات کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ نکلسن اسرارِ خودی کے ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اقبال کے احساسات ایک پرجوش مسلم کے احساسات ہیں اس کا اسلام سے یہ عقیدت مندانہ تعلق دنیا میں ایسی حکومت چاہتا ہے۔ جس میں مسلمانوں کے لیے قومیت اور وطینت کی رکاوٹیں حائل نہ ہو سکیں۔ اس کا نصب العین ایک ایسے آزاد مسلم معاشرے کا قیام ہے جس کا مرکز کعبہ ہو اور جو ایمان و ایقان کے ساتھ اللہ اور اس کی رسولؐ پر　　مضبوط عقیدہ رکھتا ہو۔ اقبال نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں اسی کی تعلیم دی ہے۔"(۲۹)

رموزِ بے خودی کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند　　سلک و گوہر ،کہکشاں واخترند
فرد می گیرد ز ملت احترام　　ملت از افراد می یابد نظام
ملتِ بیضا تن و جاں لاالہ　　سازِ مارا پردہ گرداں لا الہ
لاالہ سرمایہ اسرارِ ما　　رشتہ اش شیرازہ افکارِ ما
ہستی مسلم ز آئین است وبس　　باطنِ دینِ نبیؐ این است وبس

۱۹۱۱ سے ۱۹۲۳ تک اُردو شاعری میں بھی یہ نظریات ملتے ہیں۔ مختلف نظمیں اسی موضوع کی حامل ہیں۔ جن میں سے کچھ پر تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ آخری دو نظموں "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" میں بھی یہ موضوعات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ "ارتقاء"، "مذہب"، "پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ" میں بھی یہ مضامین ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً:

"پیوستہ رہ شجر سے"

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

"مذہب"

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

"ارتقاء"

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام یہی ہے رازِ تب و تابِ ملت عربی

اس عہد میں فن شاعری کے بارے میں ان کا نظریہ کیا تھا؟ اس کا اظہار ان کے مضمون "جناب رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ" (۱۹۱۷) سے ہوتا ہے اس میں امراءالقیس اور عنترۃ کی شاعری پر آپ کے تبصرہ کامل سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ چونکہ امراءالقیس کی شاعری شراب وشباب، کھنڈروں، حسن و عشق کے جاں گداز جذبوں اور دل ہلا دینے والے مناظر سے پُر ہے۔ اس کی شاعری سے ہوشیاری کی بجائے بے خودی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس لیے اقبال کے بقول حضورؐ کی رائے اس کے بارے میں یہ ہے کہ وہ شاعروں کا سردار لیکن جہنم میں ان کا سردار ہے جبکہ عنترۃ کی شاعری پر آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس لیے کہ ان کے شعر میں اکل حلال کے لیے سخت محنت اور شب بیداری کا ذکر تھا۔ بقول اقبال عنترۃ کا شعر صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ حضورؐ نے جو اس کی تعریف فرمائی اس سے آرٹ کے اس اصول کی تشریح ہوتی ہے کہ آرٹ حیاتِ انسانی کے تابع ہے۔ انسانی عمل کا منتہائے نظر شان وشوکت، قوت وجوش سے پُر زندگی کی تحصیل ہے اسی لیے ہر آرٹ کا غایت آفرین ہونا ضروری ہے۔ حیات بخشی کی قدر سے ایک معیاری آرٹ، جسے ادب العالیہ کہتے ہیں وجود میں آتا ہے۔ ارفع اور بلند آرٹ وہی ہے جو خوابیدہ اقوام کو بیدار کرے لیکن وہ سب کچھ جس کے اثر سے ہم اونگھنے لگیں، گردوپیش سے بے خبر ہو جائیں، وہ فرسودگی وانحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ آرٹ برائے آرٹ انحطاط کا بہانہ ہے۔ زندگی سے قوت چھیننے کا نظریہ ہے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے عنترۃ کے شعر کی خوبی کا اعتراف کرکے اور امراءالقیس کی شاعری پر عذاب کی وعید سنا کر ہم پر ہر نوع کے آرٹ کی اصل کی وضاحت کر دی۔ (۳۰)

اس دور کی شاعری میں بھی اقبال کے ان نظریات کا اظہار ملتا ہے۔ کچھ اشعار کا ذکر "شمع و شاعر" کے تحت کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید اشعار بھی ملتے ہیں۔ مثلاً نظمیں، "نصیحت"، "شاعر"، "دعا" وغیرہ۔

شاعر:

شاعرِ دلنواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری

دعا:

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے بعد جنگ عظیم اول ۱۹۱۴ میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ میں اس کا اختتام ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحادی طاقتوں نے مقبوضہ علاقوں کی بندر بانٹ شروع کی۔ خصوصاً عثمانی سلطنت کے انقلاب کے نام پر اس کی تقسیم شروع ہوئی ۔ خلیفہ کی حکومت برائے نام رہ گئی۔ عرب دنیا مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ جن پر استعماری طاقتیں کٹھ پتلی شاہ حسین کے ذریعے حکمرانی کرنے لگیں۔ ترکی کا اندرونی اندرونی خلفشار بڑھ گیا۔ مصطفی کمال نے آزادی کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اسلامی ممالک کا کوئی مستقبل نہ رہا۔ خلافت برائے نام رہ گئی۔ ساری دنیا تجارتی سرد بازاری، بیروزگاری اور افلاس میں گھر گئی۔ برصغیر میں اس رولٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا جس کے طفیل وحشت اور بربریت کے کھلے عام مظاہرے کیے گئے اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ عمل میں آیا۔ عثمانی ترکوں کی حمایت میں یہاں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ ترک موالات، عدم تعاون کی تحریکوں کا سلسلہ چلا۔ اس طرح جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی ساکن فضا میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ تحریک خلافت ناکام ہوئی۔ ترکی میں ترکوں نے فتح حاصل کی اور خلافت کی بجائے سیکولر جمہوریت کی بنیاد رکھی۔ اقبال اگرچہ عملی سیاست میں شریک نہ ہوئے لیکن ذہنی اور فکری رہنمائی میں کسی سے پیچھے بھی نہ رہے۔ چنانچہ کئی نظمیں ان کے صفحہ قرطاس پر ابھریں۔ جن میں "خضر راہ" اور "طلوعِ اسلام" نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ "اسیری" اور "دریوزہء خلافت" بھی انہیں ایام میں تحریر کی گئیں۔

"خضرِ راہ" ۱۹۲۲ میں تخلیق ہوئی۔ اس میں جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے حقیقت افروز تجزیہ پیش کیا گیا۔ اس کا پس منظر پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ دور عالمِ اسلام پر مصائب کے نزول اور استعماری طاقتوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی استعمار کا تھا۔ مزید براں روس میں ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب آ چکا تھا۔ چنانچہ اس نظم میں خضر کی شخصیت کے ذریعے دورِ حاضر کے اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے اور مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی "صحرا نوردی"، "زندگی"، "سلطنت"، "سرمایہ و محنت"، "دنیائے اسلام" گویا اس نظم میں صحرا نوردی اور گردش پیہم کی اہمیت بتائی ہے کہ رازِ دوامِ زندگی یہی ہے۔ زندگی کی حقیقت بتائی ہے کہ یہ سودوزیاں سے برتر، رواں دواں ہے، دنیا عمل کا میدان اور صلاحیتوں کی جانچ کی جگہ ہے۔ صداقت کے لیے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرنا ضروری ہے۔ "سلطنت" کے تحت ملوکیت اور مغربی جمہوریت کا راز فاش کیا ہے کہ جدید مغربی جمہوریت قدیم ملوکیت کی شکل ہے۔ "سرمایہ و محنت" کے تحت سرمایہ دار کی چیرہ دستیوں کا ذکر ہے۔ اشتراکی آفتاب کے طلوع سے مزدور کو خوشخبری سنائی ہے اور بیداری و عمل کا پیغام دیا ہے۔ "دنیائے اسلام" کے تحت دنیائے اسلام یعنی ترکی، عرب وغیرہ کے زوال پر دلسوز اظہار کیا ہے۔ اتحاد کا درس دیا ہے اور آخر میں مسلمانوں کی سطوت اور عروج کی پیش گوئی کی ہے۔ غرض یہ نظم اقبال کے تمام تر فلسفے سے پُر ہے

اور موجودہ دور کے مسائل کا بہترین حل ہے۔ اس میں خضر کی شخصیت کے مطابق بالعموم جوش بیان کی بجائے متین لب ولہجہ کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہی اس نظم کی دلکشی کا راز ہے۔ بقول ڈاکٹر عبد المغنی:

> ''اس فطری وقار کے باوجود بیان میں شاعرانہ طرفگی و تازگی ہے جو خضر کی اساطیری شخصیت کے عین مطابق ہے۔''(۳۱)

''خضرِ راہ'' کے چند اشعار دیکھیں:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

''طلوعِ اسلام'' ۱۹۲۳ میں تخلیق ہوئی۔ اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکوں کو یورپ کے پنجہ اقتدار سے نجات دلائی تو دنیائے اسلام میں دھوم مچ گئی۔ سب کی نگاہیں مصطفےٰ کمال پر پڑنے لگیں اس حالت میں علامہ اقبال کے دل میں امید افزاء خیالات پیدا ہوئے اور انہوں نے انتہائی پرجوش جذبات اور مسرت سے لبریز عالمِ کیفیت میں ''طلوعِ اسلام'' تخلیق کی۔ بقول عبد المغنی:

> ''خضر راہ نے اقبال کے فنی ارتقاء کو جس مرحلے میں چھوڑا ہے طلوع اسلام ٹھیک وہیں سے شروع ہوتی ہے خضر راہ کے آخری حصے دنیائے اسلام کو طلوع اسلام کی تمہید کہنا بالکل درست ہو گا۔''(۳۲)

گویا ''خضر راہ'' کے آخری حصے میں طلوعِ اسلام یا روشن مستقبل کی جو پیشین گوئی کی گئی تھی۔ ''طلوعِ اسلام'' اس کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ نظم کا آغاز ملت اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ کے ولولہ انگیز استقبال سے ہوتا ہے اور ایک جہانِ نو کی نوید سنائی دیتی ہے۔ دوسرے بند میں پہلے بند کے اشارات و موضوعات کو بالنفس بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے بند میں مسلمان سے خطاب کر کے اس کے مقام، حقیقت اور اصلیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے آخری شعر میں مسلم سے امامت کا کام لیے جانے کا ذکر ہے۔ چوتھے بند میں امامت کے کردار اور خصوصیات اور طریقہ کار کا ذکر ہے جس میں اخوت، محبت، یقین، ایمان اور شجاعت قابل ذکر ہیں۔ پانچواں بند ذوقِ یقین کی تشریح ہے۔ یقینِ محکم، عمل پیہم، اور محبت فاتح عالم تسخیرِ کائنات کا وسیلہ ہے اور تمام تر افکار ایک نکتہِ یقین کی تفسیریں ہیں۔ چھٹا بند ترکی اور اتحادیوں کے پیکار پر مبنی ہے اور موازنہ کیا گیا ہے کہ یقین کے بل بوتے پر اہلِ ایمان نے سائنسی قوتوں کو کس طرح شکست دی ہے۔ ساتواں بند ملت اسلامیہ اور اس کے افراد کو وہ منصب و مقام جو پچھلے بندوں میں اس کے لیے متعین کیا گیا ہے، عالمی سطح پر اجاگر کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور اس کے لیے خودی کا راز داں، اخوت کا بیاں، محبت کی زباں اور مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد اور محبت میں حریر و پرنیاں بننا ضروری ہے۔ آٹھویں بند میں وہ صورتحال ہے جس میں مثالی انسان کو اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ چنانچہ مغرب کی مادیت، شہریاری اور تہذیب حاضر کی جھوٹی صناعی کا ذکر ہے اور آخر میں طلوعِ اسلام کی طرف اشارہ ہے۔ آخری بند فارسی میں جذبہ مسرت کا شدید لیکن دلکش اور متوازن اظہار ہے۔ غرض ''طلوعِ اسلام'' اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک مکمل نظم ہے ہر بند دوسرے

کے ساتھ مربوط ہے۔ خیالات میں گہرائی و گیرائی، فلسفیانہ عمق، شان و شوکت، ترقی کا جذبہ اور دلِ مردہ کے لیے جوش آور نظم ہے ۔بقول ڈاکٹر عبدالمغنی:

> "، "طلوعِ اسلام" بانگ درا کی شاعری کا وہ عروج ہے جو اقبال کی شاعری کے نقطۂ عروج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اقبال کے نظامِ فن میں طلوع اسلام دیباچہ کمال ہے"(۳۳)

چند اشعار دیکھیں:۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
توراز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہوجا خدا کا ترجماں ہوجا

"پیامِ مشرق" تیسرا فارسی مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلی دفعہ باقاعدہ طور پر مغربی شعراء اور مفکرین سے اقبال کے ذہنی ربط کا اندازہ ہوتا ہے۔ خصوصاً گوئٹے سے عقیدت کا سراغ ملتا ہے۔ اس کتاب کا محرک بھی گوئٹے کا مغربی دیوان ہے چنانچہ سرِورق پر " درجوابِ دیوان شاعرِ المانوی گوئٹے" لکھ کر اس کو خراج عقیدت کا پیش کیا ہے۔

پیام مشرق کا پس منظر وہی ہے جو "خضرِراہ" اور "طلوعِ اسلام" کا ہے یعنی مغرب کی چیرہ دستیاں، مشرق کا سیاسی آشوب، مغربی قوم پرستی، روحانیت سے بیزاری۔ مشرق خصوصاً اسلامی ممالک کی مغرب سے مرعوبیت اور غلامی۔ اس کے ساتھ مصطفٰے کمال پاشا کی صورت میں عظمتِ رفتہ کے حصول کی امید، پہلی جنگ عظیم کے نتائج وغیرہ۔ گوئٹے کو بھی یہی حالات درپیش تھے جو موجودہ دور کو لاحق ہیں۔ اسی لیے گوئٹے مغرب کی مادیت سے بیزار ہو کر مشرق کی روحانیت کی طرف آیا تھا۔ اسی لیے اقبال گوئٹے سے متاثر ہوئے ۔اقبال نے "پیام مشرق" کے ذریعے گوئٹے کی اسی آرزو کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مغرب میں شعلہ شوق روشن کیا جائے۔ اس کے ساتھ اقبال نے ضروری جانا کہ مشرق کو منفی تصوف سے نجات دلا کر انقلابی قوتوں کے حصول کا احساس دلایا جائے انہیں دریوزہ گری کی بجائے خود شناسی، پیامِ عشق، اور خودداری کا درس دیا جائے۔ چنانچہ اقبال نے دیباچہ "پیامِ مشرق" میں اس کے موضوع کی وضاحت کی ہے اور مغرب (جرمنی) میں مشرقی تحریک کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "پیامِ مشرق" کی تصنیف کا محرک جرمن حکیم گوئٹے کا مغربی دیوان ہے"، "اس کا مدعا زیادہ تر کیہ ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے۔ جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے"، "یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی۔ جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے۔ فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے"، "مشرق اور بالخصوص اسلامی

مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ شرق کو یہ محسوس کرلیناچاہیے کہ زندگی اپنے حوالی کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہ ہو"، "میں نے اپنی فارسی تصنیفات میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"(۳۴)

غرض اقبال نے یہ سارے خیالات، اپنا تمام فلسفہ، خودی، عمل، عشق، قوت، تصادم، مغرب و مشرق کی کیفیت کو پیامِ مشرق میں بیان کیا ہے۔ پیامِ مشرق پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ "لالہِ طور" ہے جس کے تحت بابا طاہر عریاں کی طرز پر رباعیات ہیں۔ دوسرا حصہ "افکار" ہے جس میں مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں۔ جو اقبال کی فنی دسترس پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً "تسخیر فطرت"، "نوائے وقت"، "فصل بہار"، "سرور انجم"، "حدی"، "محاورہ مابین خدا وانسان"، "ساقی نامہ"، "حور و شاعر"، "زندگی و عمل"، "جوئے آب" وغیرہ۔ تیسرا حصہ "مئے باقی" کے عنوان سے ہے اس میں غزلیات شامل ہیں اور حقیقت میں حافظ کی تمام تر شیرینی ان غزلیات میں اتر آئی ہے۔ چوتھا حصہ "نقشِ فرنگ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں گوئٹے برگساں، لینن، کانت، براوو ننگ، آئن سٹائن، بائرن، مارکس، نیٹشے وغیرہ کی خوبیاں اور کمزوریاں بے لاگ طریقے سے بیان ہوئیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس حصے میں انقلابِ روس کے براہِ راست زیرِ اثر سرمایہ و محنت کے حوالے سے انتہائی دلکش نظمیں موجود ہیں مثلاً "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور"، "نوائے مزدور"۔۔۔ وغیرہ۔ پانچویں حصہ "خردہ" کے نام سے موسوم ہے جس میں چند اشعار اور قطعات وغیرہ ہیں۔ مختصر یہ کہ پیامِ مشرق میں اقبال نے اپنے فلسفہِ حیات و خیالات کو نغمہ و شعر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ "اسرار و رموز" مکمل طور پر شراب کی مستی میں ڈھل کر سامنے آگئی ہے۔ اقبال نے پیامِ مشرق کو بلاشبہ دیوانِ مغرب کے طرز پر مرتب کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بقول فرمان فتح پوری بہ لحاظ مقصد و نفسِ مضمون "پیامِ مشرق" اور دیوانِ مغرب میں کوئی مناسبت نہیں۔"(۳۵)

اس تمام تر بحث سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۹۱۱ سے ۱۹۲۳ تک کے دور میں اقبال کی شاعری اور نثر میں ان کے تمام فنی رموز اور فلسفیانہ افکار و خیالات سمٹ آئے ہیں جن کا مقصد احیائے ملت و احیائے اسلام ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالقادر سروری، ڈاکٹر، 'اقبال حیات اور شاعری، مشمولہ، اقبال شناسی، مرتبہ، مشرف احمد، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء، ص:۴۷

۲۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رورد، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیشرز، ۱۹۸۹ء، ص:۳۲۳

۳۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکرِ اقبال، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۸۸ء، ص:۱۰۸

۴۔ عزیز احمد، پروفیسر، اقبال نئی تشکیل، لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۶۸ء، ص:۱۳۳

۵۔ ایضاً، ص:۴۳

۶۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء، لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۹۸ء، ص:۵۴

۷۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اقبال کی طویل نظمیں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص:۳۲

۸۔ غلام رسول مہر، مولانا، مطالب بانگ درا، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیشرز، ۱۹۹۵ء، ص:۲۰۷

۹۔ عابد علی عابد، سید، نفائسِ اقبال، مرتبہ، شیما مجید،، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص: ۵۷

۱۰۔ ایضا، ص: ۹۱

۱۱۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء، ص: ۵۸

۱۲۔ وقار عظیم، سید، پروفیسر، اقبال: شاعر اور فلسفی''، لاہور، مطبع عالیہ، ۱۹۶۸ء، ص: ۱۶۳

۱۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء، ص: ۴۰۳

۱۴۔ عبد القادر سروری، ڈاکٹر، اقبال حیات اور شاعری، مشمولہ، اقبال شناسی، مرتبہ، نفیس احمد، ص: ۴۹

۱۵۔ عابد علی عابد، سید، شعر اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۶۴ء، ص: ۲۹۷، ۲۹۶

۱۶۔ اقبال، مقالات اقبال، مرتبہ، عبد الواحد، سید، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۹۸، ۱۹۳

۱۷۔ ایضا، ص: ۱۹۸

۱۸۔ ایضا، ص: ۱۹۳

۱۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال، سب کے لیے، ص: ۴۱۴

۲۰۔ اقبال، مقالاتِ اقبال، مرتبہ، سید عبد الواحد، ص: ۲۰۰ تا ۲۱۰

۲۱۔ ایضا، ص: ۲۱۱ تا ۲۲۲

۲۲۔ ایضا، ص: ۲۸۹ تا ۲۹۸

۲۳۔ ایضا، ص: ۲۲۳

۲۴۔ ایضا، ص: ۲۹۹

۲۵۔ عابد علی عابد، سید، شعر اقبال، ص ۳۲۱:

۲۶۔ اقبال، مقالاتِ اقبال، مرتبہ، عبد الواحد، سید، ص: ۲۳۳

۲۷۔ ایضا، ص: ۲۳۳

۲۸۔ عابد حسین، ڈاکٹر، اقبال کا تصور خودی، مشمولہ، اقبال کا تنقیدی مطالعہ، مرتبہ، اے۔ جی نیازی، لاہور، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۶۵ء، ص: ۳۱

۲۹۔ بحوالہ، جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۹ء، ص: ۴۰۰

۳۰۔ اقبال، مقالاتِ اقبال، مرتبہ، عبد الواحد، سید، ص: ۲۳۲، ۲۲۹

۳۱۔ عبد المغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظامِ فن، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء)، ص: ۲۶۴

۳۲۔ ایضا، ص: ۳۳۰، ۳۳۱

۳۳۔ ایضا، ص: ۲۸۴

۳۴۔ اقبال، دیباچہ پیامِ مشرق، مشمولہ، مقالاتِ اقبال، مرتبہ، سید عبد الواحد، سید، ص: ۲۴۱، ۲۴۹، ۲۴۸، ۲۴۷

۳۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، ص: ۴۳۰

References in Roman Script

1. Abdul Qadir, Sarwari, Dr.,"Iqbal: Hayat aur Shayari." Mushmoolah, *Iqbal Shanasi*, Musharraf Ahmad. Karachi: Nafees Academy, 1986, p. 47.
2. Javed Iqbal, Dr., Zinda Rood. Lahore: Sheikh Ghulam Ali and Sons Publishers,1989, p. 323.
3. . Khalifa Abdul Hakim, Dr., Fikr-e-Iqbal. Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1988, p. 108.
4. Aziz Ahmad, Prof. Iqbal: Nai Tashkeel. Lahore: Globe Publishers, 1968, p. 133.
5. Ibid., p. 43.
6. Ghulam Hussain Zulfiqar, Dr., Iqbal ka Zehni o Fikri Irtiqa. Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1998, p. 54
7. Rafiuddin Hashmi, Dr., Iqbal ki Taweel Nazmein. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1993, p. 32.
8. Ghulam Rasool Mehr, Mutalib-e-Bang-e-Dra. Lahore: Sheikh Ghulam Ali and Sons Publishers, 1995, p. 207.
9. Abid Ali Abid, Syed, Nafa'is-e-Iqbal, Murtba, Sheema Majid. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1990, p. 57.
10. Ibid., p. 91.
11. Ghulam Hussain Zulfiqar, Dr., Iqbal ka Zehni o Fikri Irtiqa, p. 58.
12. Waqar Azim, Syed, Prof., Iqbal: Shair aur Falsafi. Lahore: Matba 'Alia, 1968, p. 163.
13. Farman Fathpuri, Dr., Iqbal Sab ke Liye. Delhi: Educational Publishing House, 1981, p. 403.
14. Abdul Qadir Sarwari, Dr.,"Iqbal: Hayat aur Shayari." Mashmoola, Iqbal Shanasi, Nafees Ahmad, p. 49.
15. Abid Ali Abid, Syed., Shair-e-Iqbal. Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1964, pp. 296–297.
16. Iqbal, Maqalat-e-Iqbal, Murtba, Syed Abdul Wahid. Lahore: Aina-e-Adab, 1988, pp. 193, 198.
17. Ibid, p 198
18. Ibid, p 193
19. Farman Fathpuri, Dr., Iqbal Sab ke Liye, p. 414.
20. Iqbal, Maqalat-e-Iqbal, Murtba, Syed Abdul Wahid, pp. 200–210.
21. Ibid., pp. 211–222.
22. Ibid., pp. 289–298.
23. Ibid., p. 223.
24. Ibid., p. 299.
25. Abid Ali Abid, Syed., Shair-e-Iqbal, p. 321.
26. Iqbal, Maqalat-e-Iqbal, Murtba, Syed Abdul Wahid, p. 233.
27. Ibid., p. 233.
28. Abid Hussain, Dr."Iqbal ka Tasawwur-e-Khudi." Mashmoola, Iqbal ka Tanqeedi Mutala 'a, Murtba, A. G. Niazi. Lahore: Ishrat Publishing House, 1965, p. 31.

29. Javed Iqbal, Dr., Zinda Rood. Lahore: Sheikh Ghulam Ali and Sons, 1989, p. 400.
30. Iqbal, Maqalat-e-Iqbal, Murtba, Syed Abdul Wahid, pp. 229, 232.
31. Abdul Mughni, Dr., Iqbal ka Nizam-e-Fan. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1990, p. 264.
32. Ibid., pp. 330–331.
33. Ibid., p. 284.
34. Iqbal, Dibacha Payam-e-Mashriq, Mashmoola, Maqalat-e-Iqbal, Murtba, Syed Abdul Wahid, pp. 241, 247–249.
35. Farman Fathpuri, Dr., Iqbal Sab ke Liye, p. 430.